اُمت کے اتفاقی موقف سے انحراف گمراہی ہے

قرآن وسنت کی صحیح تشریح کا معیار (دوسری قسط)

مولانا محمد نعمان خالد
استاذ جامعۃ الرشید، کراچی

❺- ’’وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا‘‘ (الاسراء:۱۱۰)

ترجمہ: ’’اور اپنی نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے اور نہ بالکل چپکے چپکے ہی پڑھیے اور دونوں کے درمیان ایک طریقہ اختیار کر لیجیے۔‘‘

اس آیت کے ظاہری معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ بالکل پست آواز سے نماز میں قراءت سے منع فرمایا گیا ہے، اسی لیے آج کل بعض نام نہاد اسکالرز کا کہنا ہے کہ اُمت ظہر اور عصر کی نماز قرآن کی تعلیم کے خلاف پڑھ رہی ہے، اب ان صاحب نے آیت کے سیاق وسباق میں غور کرنے کی بجائے چودہ سو سال کی پوری اُمت کے عمل کو غلط قرار دے دیا، کس قدر ناواقفیت اور جہالت پر مبنی دلیری کی بات ہے؟ حقیقت میں اس آیت کے مختلف شانِ نزول بتائے گئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، نماز کے دوران جب بلند آواز سے قراءت کی جاتی تو مشرکین شور مچا کر اس میں خلل ڈالنے کی کوشش کرتے، اس پر حضور اکرم ﷺ نے بالکل آہستہ آواز سے پڑھنا شروع کر دیا تو اس پر یہ آیت اُتری کہ اعتدال کے ساتھ قراءت کرو۔ (تفسیر عثمانی) بعض حضرات نے یہ تاویل کی کہ تمام نمازوں میں صرف جہر اور صرف پست آواز سے پڑھنے سے منع فرمایا گیا، بلکہ ظہر وعصر میں سرّاً یعنی پست آواز سے پڑھنے اور بقیہ تین نمازوں میں جہراً یعنی بلند آواز سے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ بعض حضرات نے کہا: یہ آیت دوسری آیت مبارکہ ’’اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ‘‘ (الاعراف:۵۵) کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہے۔

❻- ’’يٰبَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ‘‘ (البقرۃ:۴۷)

ترجمہ: ’’اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور بے شک میں نے تمہیں عالم کے لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی۔‘‘

اس آیت سے بعض نام نہاد اسکالرز استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہود مسلمانوں سے افضل ہیں، کیونکہ عالم کے لوگوں میں اہلِ اسلام بھی داخل ہیں، اسی لیے بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہود ونصاریٰ اپنی تعلیمات پر عمل کرکے زندگی گزاریں تو یہ بھی نجات کے مستحق ہوں گے۔ جبکہ یہ استدلال بالکل درست نہیں، کیونکہ اس میں عالمین سے مراد صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں، مستقبل کے لوگ اور اُمتیں اس میں شامل نہیں، تمام مفسرین نے اس آیتِ مبارکہ کا یہی مطلب بیان کیا ہے، چنانچہ امام عبدالرحمٰن بن ابوحاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے:

❼-’’عن عائشةؓ، قالت: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم-: ’’توضؤوا مما مست النار.‘‘

ترجمہ: ’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرو۔‘‘

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ پر پکی ہوئی کوئی بھی چیز کھانے سے وضو کرنا واجب ہے، حالانکہ اُمت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس صورت میں وضو واجب نہیں ہوتا اور اس پر تمام وہ احادیث دلالت کرتی ہیں جن میں آپ علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آگ پر پکی ہوئی چیز کو کھایا اور پھر وضو نہیں کیا، اسی لیے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث منسوخ ہوچکی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس حدیث کی بنا پر یہ کہے کہ ایسی صورت میں وضو کرنا واجب ہے تو اُس کا یہ نظریہ درست نہیں ہوگا۔

❽-’’عن عباد بن تميم المازني، عن أبيه أنهُ قال: " رأيت رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يتوضأ ويمسح بالماء على رجليه.‘‘

ترجمہ: ’’حضرت عباد اپنے والد تمیم مازنیؓ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے وضو کیا اور پانی کے ذریعہ اپنے دونوں پاؤں پر مسح کیا۔‘‘

اس حدیث سے پاؤں پر مسح کا جواز معلوم ہوتا ہے، حالانکہ اہل السنہ والجماعہ یعنی جمہور اُمت کا موقف یہ ہے کہ پاؤں پر مسح کرنا جائز نہیں، ایسی صورت میں وضو نہیں ہوگا، یہ حدیث منسوخ ہوچکی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس حدیث کی بنا پر کہے کہ پاؤں پر مسح جائز ہے تو یہ غلط نظریہ ہوگا، جیسا کہ بعض اہلِ عرب اس طرح کی احادیث کی بنا پر پاؤں پر مسح کے جواز کے قائل ہیں۔

۹-''عن جعفر بن عمرو بن أمية، عن أبيه، قال: ''رأيت النبي صلى الله عليه وسلم يمسح على عمامته وخفيه.''

ترجمہ: ''حضرت جعفر بن عمرو بن امیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے (وضو کے دوران) اپنے عمامہ اور موزوں پر مسح کیا۔''

اس حدیث سے عمامہ پر مسح کا جواز معلوم ہوتا ہے، حالانکہ جمہور علمائے کرام کے نزدیک عمامہ پر مسح کرنا جائز نہیں، کیونکہ قرآن کریم میں واضح طور پر ''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ'' (المائدۃ:۶) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، جو کہ سر پر مسح کے بارے میں صریح ہیں، لہٰذا اس حدیث سے یہ استدلال کرنا پگڑی اور عمامہ پر مسح جائز ہے، درست نہیں۔

۱۰-''عن أبي هريرةؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''من غسل ميتا فليغتسل، ومن حمله فليتوضأ.''

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص میت کو غسل دے اس کو چاہیے کہ وہ غسل کرے اور جو میت کی چارپائی کو اُٹھائے، اسے چاہیے کہ وہ وضو کرے۔''

اس حدیث میں جنازہ کی چارپائی اُٹھانے پر وضو کرنے کا حکم دیا گیا، جبکہ ایسی صورت میں وضو کا وجوب کسی اور آیت یا حدیث سے ثابت نہیں، اس لیے اس حدیث کو چھوڑ دیا گیا اور اس پر عمل نہیں کیا گیا، کیونکہ دیگر تمام نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کے ٹوٹنے کی علت نجاست کا خروج ہے اور وہ علت یہاں نہیں پائی گئی۔

۱۱-''عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله - صلى الله عليه وسلم -: ''لا وضوءَ إلا من صوت أو ريح.''

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت تک وضو واجب نہیں جب تک ہوا کے نکلنے کی آواز یا بُو نہ محسوس کر لی جائے۔''

اس حدیث کے ظاہر پر بھی عمل نہیں کیا گیا، کیونکہ اگر کسی شخص کو ہوا کے خروج کا یقین ہو جائے، مگر زکام وغیرہ کی وجہ سے اس کو بو محسوس نہ ہو اور بہرہ ہونے کی وجہ سے اس کو آواز بھی سنائی نہ دے تو بھی اس شخص کا بالاتفاق وضو ٹوٹ جائے گا، لہٰذا اگر کوئی شخص اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے آواز اور بُو محسوس نہ ہونے کی صورت میں وضو کے عدمِ وجوب کا موقف اختیار کرے تو یہ واضح غلطی اور خطا ہوگی۔

⑫۔ ’’قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ’’إن هٰذا القرآن أنزل على سبعة أحرف، فاقرؤوا ما تيسر منه.‘‘

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے، پس اس میں سے جتنا آسانی سے ہو پڑھو۔‘‘

اس حدیثِ پاک میں ’’سبعة أحرف‘‘ سے سات حروف مراد نہیں، بلکہ قرآن کو سات طریقوں سے پڑھنا مراد ہے، جس کی تفسیر میں محدثین اور قراء کرام کا اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ احادیثِ مبارکہ میں غریب احادیث (ایسی احادیث جن کا معنی لغوی اعتبار سے مشکل ہونے یا ان کے الفاظ میں کئی معانی کا احتمال ہونے کی وجہ سے صحیح مراد تک پہنچنا مشکل ہو) کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، ان احادیث کے درست معنی کی تعیین علمائے کرام رحمہم اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، اس لیے محدثین کرام نے ایسی احادیث کے معنی کی تعیین کے لیے غرائب احادیث کے نام سے مختلف کتابیں لکھی ہیں۔

قرآن وسنت کی صحیح تشریح کا معیار

پیچھے ذکر کی گئی وجوہ سے معلوم ہوا کہ اُمت جب کسی قرآن یا حدیث کے ظاہری معنی پر عمل پیرا نہیں ہوتی تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہوتی ہے، لہٰذا کسی بھی آیت اور حدیث کا وہی مفہوم اور مطلب لینا ہوگا جس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، امت کے جمہور مفسرین، محدثین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ نے معتبر قرار دیا ہے، اس مفہوم سے ہٹ کر کسی بھی آیت یا حدیث کی تشریح ناقابلِ قبول ہے، لہٰذا ایسی تشریح اگر ضروریاتِ دین یا شریعت کے کسی قطعی امر کے خلاف ہو تو ایسی تشریح پیش کرنے والا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوگا، اس کی تاویلِ باطل کو کالعدم شمار کیا جائے گا اور اس کی یہ تاویل اس کے گمراہ ہونے سے مانع نہیں ہوگی، لہٰذا عام آدمی کے لیے قرآن وسنت کی عبارات کے صحیح معانی اور درست مطالب تک پہنچنے کے لیے درج ذیل تین اصولوں میں سے کسی ایک اصول کو لینا ہوگا:

اصول نمبر: ۱

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست دین سیکھا اور اُن کے واسطہ سے ہی دین امت تک پہنچا، اس لیے قرآن وسنت کی درست تفسیر اور تشریح کے سلسلہ میں ان کی تشریحات کو معیار قرار دیا جائے، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ میری اُمت کے تہتر فرقے ہوں گے، سب جہنم میں جائیں گے، صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا، عرض کیا گیا: وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میرے اور میرے صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کے راستے پر چلنے والا ہوگا، دیکھیے حدیث:

’’عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”ليأتين على أمتي ما أتى على بني إسرائيل ....وإن بني إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة، وتفترق أمتي على ثلاث وسبعين ملة، كلهم في النار إلا ملة واحدة“، قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ قال: ”ما أنا عليه وأصحابي.‘‘

ترجمہ:’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک میری امت پر وہی زمانہ آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا......بنی اسرائیل کے بہتر فرقے بنے تھے، میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی، ایک فرقہ کے علاوہ باقی تمام فرقے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون سا فرقہ ہے؟ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جو میرے اور میرے اصحابؓ کے راستے پر چلے گا۔‘‘

اصول نمبر:۲

دوسرا اُصول یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تشریح میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے کے جمہور علمائے کرام کی تشریح کو معیار قرار دیا جائے، کیوں کہ ان کے خیر پر ہونے کی گواہی بھی حدیث میں آئی ہے، دیکھیے حدیث:

’’عن عبد الله، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”خير أمتي القرن الذين يلوني، ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم.‘‘

ترجمہ:’’حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت میں سے سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔‘‘

لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تبع تابعین تک کے زمانے کے جمہور علمائے کرام نے قرآن وسنت کی کسی آیت یا حدیث کا جو مطلب بیان کیا ہو وہی برحق ہوگا اور جو اس کے خلاف ہو وہ باطل شمار ہوگا۔

اصول نمبر:۳

تیسرا اصول یہ ہے کہ پوری امت کی اکثریت کا قول لیا جائے کہ امت کی اکثریت نے کس آیت کا کیا مطلب لیا ہے، کیونکہ سنن ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ میری پوری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، بعض

ضعیف روایات میں یہ بھی منقول ہے کہ جب تم میری امت کے درمیان اختلاف پاؤ تو امت کی اکثریت کا اتباع کرو، دیکھیے حدیث:

’’حدثني أبو خلف الأعمى، قال: سمعت أنس بن مالك، يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: "إن أمتي لا تجتمع على ضلالة، فإذا رأيتم اختلافا فعليكم بالسواد الأعظم.‘‘

ترجمہ:’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک میری پوری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، پس جب تم میری اُمت میں کسی قسم کا اختلاف پاؤ تو تم امت کی اکثریت کے اتباع کو لازم پکڑو۔‘‘

اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت جماعت کے ساتھ ہے اور یہاں جماعت سے مراد امت کی اکثریت ہے۔ نیز قرآن کریم کی درج ذیل آیت مبارکہ سے بھی یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے:

’’وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا‘‘ (النساء:۱۱۵)

ترجمہ:’’اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہوجانے کے بعد بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے، اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کردیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔‘‘

(آسان ترجمۂ قرآن)

اس آیتِ مبارکہ میں واضح طور پر مؤمنین کے راستے کے علاوہ دوسرے راستے کے گمراہی پر ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس پر دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے، نیز یہاں مومنین سے اُمت کی اکثریت مراد ہے، جیسا کہ پیچھے ذکر کردہ احادیث سے معلوم ہوا۔

خلاصہ یہ کہ آج کے دور میں اگر کوئی شخص عقائد یا دینی مسائل واحکام کے حوالے سے اپنی کوئی رائے پیش کرتا ہے تو ان چار اصولوں پر پرکھنا ہوگا، اگر ان کے موافق ہے تو اس کا موقف قبول ہوگا، ورنہ رد کردیا جائے گا، لہٰذا آغا خانی حضرات کا صوم کا معنی ’’خاموش رہنا‘‘ کرنا، اسماعیلی حضرات کا صلاۃ سے ’’دعا‘‘ مراد لینا اور قادیانیوں کا ختمِ نبوت سے صرف تشریعی نبوت کو ختم ماننا اور غیر تشریعی نبوت کو جاری سمجھنا بالکل غلط اور باطل ہے، اسی طرح کسی شخص کا ختمِ نبوت یا نزولِ مسیح علیہ السلام سے متعلقہ آیات میں تاویل کرکے کسی قسم کی نبوت کو جاری ماننا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ونزول کا انکار کرنا بلاشبہ کفر ہے، چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ’’شفاء العليل‘‘ میں

فرماتے ہیں:

”والتأويل الباطل يتضمن تعطيل ما جاء به الرسول والكذب على المتكلم أنهٗ أراد ذلك المعنى، فتتضمن إبطال الحق وتحقيق الباطل ونسبة المتكلم إلى ما لا يليق به من التلبيس والألغاز مع القول عليه بلا علم أنه أراد هذا المعنى، فالمتأول عليه أن يبين صلاحية اللفظ للمعنى الذي ذكرهٗ أولا، واستعمال المتكلم له في ذلك المعنى في أكثر المواضع حتى إذا استعمله فيما يحتمل غيره حمل على ما عهد منه استعماله فيه، وعليه أن يقيم دليلا سالما عن المعارض على الموجب لصرف اللفظ عن ظاهره وحقيقته إلى مجازه واستعارته وإلا كان ذٰلك مجرد دعوى منه، فلا تقبل.“

البتہ قرآن وحدیث کی ایسی تشریح اور تاویل جوامت کے اجماعی موقف کے خلاف نہ ہو اور اس کی وجہ سے کسی قطعی حکم کا انکار لازم نہ آتا ہو تو وہ جائز ہے، چنانچہ مفسرین کی تفسیری آراء اور محدثین کرام کی تشریحات اسی پر محمول ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....